مولانا مودودی کی تاریخ نویسیٔ دکن:

ایک نادر و منظوم تاریخ ''فتوحاتِ آصفی'' کے مطالعے و تجزیے پر مبنی ایک غیر معروف تحریر

معین الدین عقیل *

ABSTRACT:

Saiyyad Abul A'la Maodudi has not only been a great Islamic thinker and revivalist of South Asia in modern history, but he has been a versatile writer at his early age. He showed a great interest in historiography of contemporary Turkey and Hayderabad State in later Moghal and colonial India. Hayderabad and Turkey, being his own and his ancesters' birth place, he took more interest in writing books on both these regions. He produced 3 books alone on Hayderabad: Daolat-e-Asefiya aor Hukumat-e Bartaniya: Siyasi Ta'luqaat ki Tareekh par ek Nazar; Tareekh-e Dakkan; Dakkan ki Siyasi Tareekh; in the age of thirty years. Besides these prominent books, he wrote a marvellous article on Futuhaat-e-Asefi: Asef Jah Awwal ki ek Manzoom Sawaneh Umri, written by Abul Faez Ma'ni Dehlavi. This article was written by Maodudi to introduce a very rare historical text on the age and political struggle of Asef Jah, the founder of Hayderabad State, in third decade of the 18th century. This book, according to Maodudi, is a highly valuable source for the history of Hayderabad and its founder that still not considered and used by any historian of the region. This article is based on an effort to introduce and evaluate Maodudi's article first time as it is still not listed in any bibliography of Maodudi and not known to the scholars and writers interested in Maodudi's works and academic contribution.

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) اپنی مذہبی و فکری کاوشوں سے قبل، اپنے ذوق اور اپنی دلچسپیوں کا اظہار ادب اور تاریخ میں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے بچپن ہی میں عربی زبان میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ تیرہ ہی سال کی عمر میں شیخ عبدالعزیز شاویش (۱۸۷۶ء۔۱۹۲۹ء) کی تصنیف "الاسلام والاصلاح" کا اور ساتھ ہی قاسم امین بے (۱۸۶۳ء۔۱۹۰۸ء) کی کتاب "المرأۃ الجدیدہ" کا ترجمہ اردو میں کر سکیں(۱)۔ یہ تراجم اس وقت ان کے علمی ذوق کے اولین مظاہر تھے۔ اس ذوق کے ذیل میں، کہ جب مطالعے کی ابھی ابتدا ہے، کسی ایک موضوع کا تعین نظر نہیں آتا، بلکہ دل چسپیوں کی طرح موضوعات بھی تنوع کے حامل رہے ہیں۔ کہیں وہ "برق یا کہربا" کی تصریح و وضاحت کر رہے ہیں یا "انگریزی لغت میں دوستی کے معنی" تلاش کر رہے ہیں۔ ایک جانب وہ "حالاتِ زندگی آنریبل پنڈت مدن موہن

* پروفیسر، ڈاکٹر، سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ کراچی　　برقی پتا: moinuddin.aqeel@gmail.com

تاریخِ موصولہ: ۹/۳/۲۰۱۴ء

مالو یہ آف الہ آباد" لکھ رہے ہیں تو دوسری جانب "مسٹر آصف علی بیرسٹر کی بے دردیاں، ٹیگور کے ساتھ" پر اظہارِ خیال کررہے ہیں۔ "قمار خانہ مونٹی کارلو" بھی ان کے قلم کی توجہ سے دور نہ رہا۔خالص ادب اور اس کے قریبی موضوعات بھی ان کی توجہ میں رہے۔قربان علی بیگ سالک (۱۸۲۴ء۔۱۸۸۰ء) سے خاندانی قرابت نے ان کی شاعری پر تین چار مضامین ان سے اسی زمانے میں لکھوالیے اور "حسنِ ادا اور ادب" کے تعلق سے اسلوبیات بھی ان کے پیشِ نظر رہے(۲)۔

اس طرح کے موضوعات کو اپنی دل چسپی میں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ رسائل: "تاج" اور "مسلم"(۳) اور پھر "الجمعیت"(۴) کے توسط سے صحافت سے وابستگی نے ان کے قلب و ذہن کو عصری مسائل اور حالات وحوادثِ زمانہ سے بھی قریب کردیا تھا۔نوجوانی کے زمانے میں ان کے مضامین: "سمرنا میں یونانی مظالم"، "ترکی میں عیسائیوں کی حالت اور مصطفی کمال پاشا" عالمِ اسلام کے حوادث اور قومی ادبار سے ان کی دل گرفتگی کی مثالیں ہیں(۵)۔غالباً ترکی کی اسی ابتلا و افتاد کی صورتِ حال نے انھیں طویل مضمون "ہندوستان کا صنعتی زوال اور اس کے اسباب پر تاریخی تبصرہ" لکھنے پر مجبور کیا(۶)۔اسی ضمن میں ان میں تاریخ اور تاریخ نویسی سے دل چسپی کا پیدا ہونا غیر متوقع نہ تھا۔ان کی یہ دلچسپی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ان کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے رسالوں: "تاج"، "مسلم"، اور "الجمعیت" میں جو کچھ انھوں نے بحیثیت مدیر لکھا، ان کی تفصیلات معلوم و مرتب نہیں، لیکن خیال ہے کہ حالاتِ حاضرہ کے پس منظر میں ملکی و عالمی، خصوصاً عالمِ اسلام کے حالات نے انھیں ضرور تاریخی تناظر کو اپنے پیشِ نظر رکھنے پر مجبور رکھا ہوگا۔تاریخ نویسی کے زمرے میں ان کی تصانیف شمار کی جائیں تو، ان کی تفسیر "تفہیم القران" سے قطع نظر، کہ جس میں قبلِ اسلام کے واقعات کی تحقیق و جستجو میں اور ماضی کی اقوام کی تاریخ و تہذیب کے حوالوں میں اپنے مطالعۂ تاریخ سے انھوں نے بالعموم مدد لی ہے، اور اپنی معروف تصنیف "الجہاد فی الاسلام" میں تاریخ کے حوالے ان کا سہارا بنتے رہے ہیں، تاریخ نویسی میں ان کی مستقل تصانیف: "دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ: سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر" (۱۹۲۸ء)، "سلاجقہ"، حصۂ اول (۱۹۲۹ء)، "تجدید و احیائے دین" (۱۹۴۰ء)، "دکن کی سیاسی تاریخ" (۱۹۴۴ء)، اور "خلافت و ملوکیت" (۱۹۶۵ء) معروف ہیں۔

تاریخ نویسی میں دکن کی تاریخ سے ان کی دل چسپی کئی اسباب کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔اس ضمن میں تصنیف و تالیف کے ابتدائی دور میں انھوں نے یا تو محض عصری تقاضوں کے تحت ترکی کو موضوع بنایا یا دکن اور مملکتِ آصفیہ حیدرآباد ان کا موضوع بنے۔خلیفۃ المسلمین کی سرزمین ترکی اس وقت ابتلا کا شکار تھی اور اس سے ایک نسبت خاندانی بھی تھی کہ ان کی ننھیال کا تعلق ترکی سے تھا اور اجداد سلسلہ چشت سے وابستہ تھے اور ہرات (ترکستان) ان کا وطنِ مالوف تھا(۷)۔ مملکتِ آصفیہ حیدرآباد سے ان کا تعلق جذباتی بھی ہوسکتا تھا کہ اس کا ایک علاقہ محروسہ اورنگ آباد ان کی جائے پیدائش تھا، جہاں انھوں نے اپنے بچپن کا ایک یادگار وقت گزارا تھا۔اس کی یادیں تاعمر ان کے ساتھ رہیں۔لیکن ان کے قلم کی کاوشوں کے تنوع کو دیکھ کر یہ خاندانی اور جذباتی وابستگیاں محض حسنِ اتفاق بھی ہوسکتی ہیں۔

دکن یا مملکتِ آصفیہ کی تاریخ نویسی کے ضمن میں ان کی اولین مستقل کاوش، دستیاب معلومات کے مطابق، "دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ: سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر" (۸) تھی۔اس کو موضوع بنائے جانے کی صراحت انھوں نے اپنے پیش لفظ میں بیان کردی ہے۔ان کے لیے یہ حیران کُن تھا کہ ایک ایسی مستحکم مملکت جو "پوری برٹش انڈین امپائر کا مرکزِ ثقل" ہو، جسے اپنی ۱۳ ملین رعایا پر کامل حاکمیت حاصل ہو، جس کا رقبہ یورپ کی عظیم الشان سلطنتوں کے مساوی ہو، اس نے کیوں کر برطانوی سرپرستی کو قبول کرلیا؟ اور اپنی خارجی آزادی اور اپنے فوجی استقلال کو اپنے مساوی بلکہ باج گزار حلیف کے سپرد کردیا؟ اس حیرت کو رفع کرنے یا ایسے پیدا شدہ سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے کہ ڈیڑھ صدی کے حلیفانہ روابط میں دونوں مملکتوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات رہے ہیں؟ اور دونوں نے ایک دوسرے سے دوستی کا حق کیسے ادا کیا ہے؟ (۹) یہاں مصنف کا رویہ برطانوی حکومت کے لیے جارحانہ ہوگیا ہے۔ان کے خیال میں دولتِ آصفیہ نے دوستانہ وفاداری کو نباہنے کی کوشش کی ہے، جب کہ حکومتِ برطانیہ نے اپنے ''یارِ وفادار'' کو ہمیشہ مایوس کیا ہے (۱۰)۔

یہ کتاب مولانا مودودی کے ''الجمعیت'' کے زمانہ ادارت فروری ۱۹۲۵ء تا مئی ۱۹۲۸ء کے دوران لکھی گئی تھی جب کہ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف سے قبل متعدد مضامین حکومتِ حیدرآباد اور نظامِ دکن کی حمایت میں اس رسالے میں تحریر کیے تھے (۱۱)۔ان مضامین میں اور اپنی اس کتاب میں مولانا مودودی نے حکومتِ حیدرآباد اور نظام کا دفاع کرتے ہوئے ان کی حکمتِ عملیوں کی بڑی حد تک تائید وحمایت کی ہے لیکن حکومتِ برطانیہ پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے حکومتِ حیدرآباد کا مجرم قرار دیا ہے۔حیدرآباد میں اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد، حکومتِ حیدرآباد کی سیاسی مجبوریوں اور مصلحتوں کے تحت یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ آیا حیدرآباد کی حدود میں اس کتاب کو ضبط کرلیا جائے؟ لیکن عمالِ حکومت کی آراء میں اختلاف کے سبب معاملہ رفت وگزشت ہوگیا (۱۲)۔اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے بارے میں مولانا مودودی کا جو تنقیدی اور جارحانہ نقطہ نظر تھا، حکومتِ حیدرآباد کے لیے، مصلحتاً گوارا نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ قبول تھا۔

اس کتاب کی تصنیف کے لیے مولانا مودودی نے جو جستجو اور محنت کی ہے اس کا اندازہ اس کے حواشی میں درج مآخذ کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے جن میں دکن کی تاریخ سے متعلق ہم عصر اردو وفارسی مطبوعات ہی نہیں وہ انگریزی کتب بھی شامل ہیں جو اس کتاب کی تصنیف سے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں شائع ہوئی تھیں۔ان سے انھوں نے بھرپور استفادہ کرکے مفید مطلب اور ضروری معلومات اخذ کیں اور جہاں جہاں ضروری محسوس کیا وہاں متعلقہ دستاویزات کے حوالے دیے ہیں۔واقعتاً تاریخ نویسی کا یہ اسلوب اس وقت اردو میں بہت عام نہیں تھا۔کم ہی مصنفین نے اس طرح کے مآخذ کی جستجو اور تلاش اور ان سے حقیقی استفادے کا مظاہرہ کیا ہے۔

دکن یا مملکتِ حیدرآباد کی تاریخ پر مولانا مودودی کی دوسری مستقل اور اہم تصنیف: ''دکن کی سیاسی تاریخ'' ہے (۱۳)۔''دولتِ آصفیہ اور مملکت برطانیہ'' تو ایک عصری تناظر میں لکھی گئی تھی اور ایک عمومی دل چسپی کا اس میں احاطہ نہ

تھا،لیکن خود مملکتِ آصفیہ کی تاریخ ،جس میں اس کے قیام کا پس منظر اور عہد بہ عہد حالات و واقعات شامل ہوں ، مولانا مودودی کی نظر میں اس کی ضرورت موجود تھی، چناں چہ اپنی مذکورہ کتاب کی تصنیف اور اشاعت کے بعد انھوں نے اس ضرورت کے ذیل میں اپنی اِس تصنیف کے لیے، جب وہ ۱۹۳۰ء میں بھوپال میں چند ماہ مقیم رہے،تو مواد جمع کرنا شروع کیا تھا اور وہاں سے جولائی ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد منتقل ہوئے تو وہاں اسی جستجو اور مآخذ کی جمع آوری میں منہمک ہوگئے۔ان کا ارادہ ایک مفصل تاریخ لکھنے کا تھا جو چار جلدوں پر مشتمل ہوتی۔انھوں نے اس کا آغاز بھی کردیا کہ ان کے ایک دوست مولوی احمد عارف (متوفی ۱۹۴۹ء) نے اس کو دیکھ کر انھیں مشورہ دیا کہ ان کا منصوبہ تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید ہوسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی کتاب کی ضرورت بھی ہے جو مبتدی طلبہ کے لیے ہو۔یہ مشورہ انھیں پسند آیا چناں چہ انھوں نے بہت آسان اسلوب میں دکن کے عہد قدیم سے قطب شاہی عہد تک کے مختصر حالات لکھ دیے اور خود مولوی احمد عارف نے اس میں شامل کرنے کے لیے مغلیہ عہد اور آصف جاہی عہد کے حالات تحریر کیے۔اس طرح ایک مشترکہ کوشش سے ایک کتاب ''تاریخ دکن'' مرتب ہوگئی اور شائع بھی ہوگئی (۱۴)۔کتاب کے سرورق پر اشاعت کا سن ۱۳۴۱ف اور مولانا مودودی کے دیباچے پر ۱۳۵۱ھ درج ہے۔اس اعتبار سے یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر خود مولانا مودودی نے اپنی 'خودنوشت' میں ''مختصر تاریخ دکن'' کے طور پر کیا ہے لیکن اس کا ذکر ان کی دستیاب تصانیف کی کسی فہرست یا کتابیات میں نظر نہیں آتا (۱۵)۔احمد عارف صحافت سے منسلک تھے اور ایک بہت مؤثر اخبار ''صبح دکن'' کے مدیر تھے، جسے انھوں نے ۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۹ء) سے جاری کیا تھا۔اس اخبار کو قومی تحریکوں میں قومی امنگوں کی ترجمانی اور حکومتِ وقت کی تائید وحمایت کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل تھی۔حیدرآباد کے اکابر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ادب اور فنون لطیفہ سے انھیں خاصی دل چسپی تھی۔(۱۶)

مولانا مودودی کی یہ غیر معروف اور نادر تصنیف اگرچہ طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی لیکن اس کے لیے محنت اور اہتمام خاصے کیے گئے تھے۔انھوں نے خود بیان کیا ہے کہ اس کا تاریخی مواد نہایت معتبر و مستند مآخذ سے اخذ کیا گیا ہے اور ایسے واقعات شامل کرنے سے گریز کیا گیا ہے جن کی سند مشکوک ہو۔کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ کے ذہن میں دکن اور اس کے جغرافی، نسلی، لسانی، تاریخی اور معاشرتی حالات کی ایک صاف اور واضح تصویر نقش ہوجائے۔کوشش کی گئی ہے کہ جو جو قومیں اس علاقے میں وارد ہوئیں اور جو حکومتیں یہاں قائم ہوئیں، ان کے زمانی اور جغرافی حدود اور ان کے پیدا کردہ تغیرات اور ان کے قائم کردہ اثرات کو نمایاں کیا جائے۔اس کا ایک امتیاز یہ ہے کہ تاریخ دکن کے متعلق جو نظریات قائم کرلیے گئے تھے ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے وہ نظریات اختیار کیے گئے ہیں جو جدید تحقیقات و مطالعات کا نتیجہ ہیں۔مصنفین کے اس عمل کے پسِ پشت مزید اہم بات یہ ہی ہے کہ طلبہ کے ذہن میں ابھی سے ایک غیر محسوس طور پر تاریخ کے فلسفیانہ مطالعہ کا ذوق پیدا ہوجائے (۱۷)۔

چوں کہ یہ کتاب طلبہ کے لیے لکھی گئی تھی اور اس کا مقصد بظاہر انھیں دکن کی تاریخ سے واقف کرانا تھا لیکن ساتھ ہی وہ

ان میں تاریخ کے مطالعے کا ذوق وشوق عام کرنے اور ابھی سے ان میں ایک 'غیر محسوس طور پر تاریخ کے فلسفیانہ مطالعے' کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ایسے اہتمام بھی اس کتاب میں کرتے نظر آتے ہیں، جو منفرد ہیں۔ مثلاً اس کتاب کو موضوعات اور عہد کے لحاظ سے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا، لیکن ہر باب کو بھی ذیلی اسباق میں تقسیم کیا گیا، تاکہ طلبہ ہر عہد کی بھی ذیلی موضوعاتی تفریق وتقسیم کی مصلحت سے واقف ہوسکیں اور تاریخ کو ان کے تناظر میں سمجھ سکیں۔ پھر اساتذہ سے بھی ان مصنفین کو یہ توقع ہے کہ تاریخ پڑھاتے ہوئے وہ پہلے اپنے سبق کا ایک عمومی خاکہ طلبہ کے ذہن نشین کریں اور دوسرے مرحلے میں واقعات یاد کرائیں۔ لیکن تفصیلات بیان کرتے ہوئے غیر اہم شخصیات اور سنین کو زیادہ اہمیت نہ دیں۔ اساتذہ سے انھیں یہ بھی توقع ہے کہ تاریخ پڑھانے سے پہلے خود غور کریں کہ تاریخ کے کونسے واقعات زیادہ اہم ہیں اور علاقائی نقشے بھی اچھی طرح خود ذہن نشین کریں اور طلبہ کو بھی ذہن نشین کرائیں۔ ان کے خیال میں ہر تاریخی تغیر اور اہم واقعے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے نقشوں سے رجوع کرنا ضروری ہے(۱۸)۔ اس حکمت کے تحت مصنفین نے نقشوں کا اہتمام بڑی محنت سے کیا ہے اور ان کی مدد سے ہر عہد کی جغرافیائی حد بندیوں کو واضح کیا ہے۔ نسلوں اور زبانوں کے لحاظ سے بھی نقشے شامل کیے گئے ہیں۔

مولانا مودودی نے اس کتاب کے چھے ابواب: ہمارا ملک اور اس کے باشندے؛ دولتِ آصفیہ کا رقبہ اور آبادی؛ پرانے زمانے کی تاریخ؛ دکن کی آریہ اور دراوڑ ریاستیں؛ دکن میں مسلمانوں کی آمد؛ سلطنتِ بہمنیہ؛ دکن کی پانچ ریاستیں، تحریر کیے ہیں۔ یہ ابواب کُل ۱۷۱ صفحات پر مشتمل ہیں، جب کہ کتاب کی کُل ضخامت ۲۲۴ صفحات ہے۔ اس طرح ۵۳ صفحات مولوی احمد عارف نے تحریر کیے تھے۔

یہ کتاب دکن کی تاریخ نویسی میں مولانا مودودی کی ایک درمیانی کڑی ہے۔ اس کی تمہید میں جو باتیں تاریخ کے ضمن میں انھوں نے تحریر کیں، ان سے اور اس کتاب کے خاکے سے تاریخ نویسی کے تعلق سے ان کے نقطہ نظر کو اخذ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

دکن کی تاریخ کے ضمن میں اس تصنیف، یا اولین تصنیف سے قطع نظر، ایک مبسوط تصنیف کی صورت میں ایک بڑا منصوبہ بھی بہر حال ان پیش نظر رہا جس کا آغاز انھوں نے بڑی دل جمعی اور محنت سے اپنی نسبتاً ضخیم تصنیف ''دکن کی سیاسی تاریخ'' سے کیا جو مارچ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اگرچہ ایک وسیع تر منصوبے کے تحت لکھی گئی تھی اور مولانا مودودی اسے چالیس ابواب تک وسعت دینا چاہتے تھے لیکن یہ محض قیام مملکتِ آصفیہ (۱۷۲۴ء) کے پس منظر ہی کا احاطہ کرتی ہے اور بانیِ مملکت نظام الملک آصف جاہ اول (۱۶۶۱ء۔۱۷۴۸ء) کے دورِ آخر تک کا بھی احاطہ نہ کیا جاسکا اور نادر شاہ (متوفی ۱۷۴۷ء) کے حملۂ دہلی (۱۷۳۹ء) پر اس تاریخ کا اختتام ہوجاتا ہے۔ جس قدر بھی تاریخی واقعات اور سیاسی حالات اس میں یکجا ہوگئے ہیں وہ مفصل ہیں اور ان کے بیان کرنے میں خاصی وضاحت روا رکھی گئی ہے۔

یہ تاریخ تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب بانیِ مملکت کے اسلاف اور خاندان کے تذکرے پر مشتمل ہے، جب کہ دوسرا باب اورنگ زیب کی رحلت (۱۷۰۷ء) کے بعد قیام مملکت آصفیہ تک کے عمومی سیاسی واقعات کو تفصیل سے

پیش کیا گیا ہے۔تیسرا باب قیامِ مملکت کے بعد نادرشاہ کے حملے اور اس کے اثرات کے جائزے پر مشتمل ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ اس تاریخ کے لکھنے کے لیے جو جو مآخذ، مطبوعہ وغیر مطبوعہ، ضروری ہو سکتے تھے، انھیں پیشِ نظر رکھا جائے۔اس ارادے میں خاصی کامیابی نظر آتی ہے۔کتاب کے آخر میں بڑی محنت سے مملکت کا ایک مکمل نقشہ بھی ترتیب دیا گیا ہے جس میں اماکن کے ساتھ ساتھ صوبوں کی قدیم اور حالیہ حدود کو واضح کیا گیا ہے۔پھر مزید یہ کہ نقشے کی تشریح بھی کی گئی ہے اور آمدنی کی تفصیلات بھی درج کی گئی ہیں۔اس طرح اس کتاب کی تصنیف کے لیے مصنف نے خاصی محنت وجستجو کا ثبوت دیا ہے اور وہ مواد و معلومات یکجا کی ہیں جو قدیم و معاصر تاریخوں میں منتشر اور بے ترتیب پھیلی ہوئی تھیں۔اس کے باوجود کہ اس تصنیف میں پیش کردہ دور اور خصوصاً نظام الملک کے حالات اور عہد پر قدیم اور جدید کتابوں کی کمی نہیں لیکن مولانا مودودی کی یہ تصنیف اپنے اسلوب اور معلومات کے لحاظ سے اپنے وقت کے اور آج کے قارئین کے لیے، قدیم تصانیف کے مقابلے میں، زیادہ پُرکشش اور جاذبِ توجہ ہے۔

دکن کی تاریخ کے تعلق سے مولانا مودودی کی ان مذکورہ تصانیف کو ان کے اس منصوبے کی جزوی کاوشیں کہا جا سکتا ہے، جو ان کے پیشِ نظر تھا۔ان کا یہ منصوبہ جو چالیس ابواب پر مشتمل تھا، ''تاریخِ دکن کا خاکہ'' کے عنوان سے دستیاب ہے اور مولانا مودودی سے متعلق دستاویزات واسناد کے مجموعے: ''وثائقِ مودودی'' (۱۹) میں شامل ہے۔اسے انھوں نے ۱۹۲۸ء میں ترتیب دیا تھا۔یہ چالیس ابواب پر مشتمل تھا اور اس کے مطابق مولانا مودودی نے اس کے چونتیس ابواب کا مواد جمع کرلیا تھا اور ہر باب کا ایک مختصر خاکہ بھی تحریر کرلیا تھا کہ جس کے مطابق انھیں وہ باب تحریر کرنا تھا۔لیکن وہ اس منصوبے میں مزید پیش رفت نہ کر سکے، دیگر منصوبوں اور کاموں میں مصروف ہو گئے۔

اپنے اس منصوبے کے تحت وہ فقط اس کے ۱۸ ابواب کے موضوعات اپنی تصنیف ''دکن کی سیاسی تاریخ'' میں سمیٹ سکے تھے لیکن جو کچھ انھوں نے اس تصنیف (''دکن کی سیاسی تاریخ'') میں تحریر کیا، اگر وہ اس منصوبے کے مطابق، اور اس کے متعینہ معیار کے مطابق ہوتا تو یہ تصنیف شاید مزید بلند معیار اور اسلوب کی حامل ہوتی۔اس منصوبے کے معیار کا اندازہ، اس کے متعینہ موضوعات یا ابواب کی فہرست سے تو ہوتا ہی ہے لیکن ہر باب کے تحت جو خاکہ یا اس کے خام عنوانات درج کیے گئے ہیں، ان سے قطع نظر ہر باب کے لیے انھوں نے مآخذ کا ایک تعین بھی کرلیا تھا کہ اس باب کی تصنیف میں ممکنہ طور پر ان کے لیے کون کون سی کتب مددگار ثابت ہوں گی۔اس فہرستِ ابواب اور اس کے لیے ممکنہ مصادر و مآخذ کی فہرست کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک تو بہت محنت وجستجو سے ان تمام اہم تصنیف کے بارے میں معلومات حاصل کرلی تھیں جو کسی انفرادی ابواب کے لیے ناگزیر ہو سکتی ہیں۔پھر یہ بھی قابلِ رشک ہے کہ ان کی رسائی یا معلومات میں قدیم ونادر، مطبوعہ وغیر مطبوعہ، فارسی واردو اور انگریزی، ہر طرح کی متعلقہ وضروری کتب شامل تھیں۔یہ بھی حیران کن ہے کہ ان کی نظر میں متعلقہ موضوعات یا عنوانات پر جدید وقدیم ہر طرح کی انگریزی کتب، ، جو بالعموم

ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور کا احاطہ کرتی ہیں، ان کے مآخذ کی فہرستوں میں درج نظر آتی ہیں۔اس طرح اس خاکے سے ان کے مطالعے کی وسعت، تازگی، اور تاریخ سے ان کی غیر معمولی دل چسپی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔یہ خاکہ یا منصوبہ چوں کہ ''وثائقِ مودودی'' میں عکسی شائع ہوا ہے، اور چوں کہ مولانا مودودی کا دست نوشتہ ہے، اس میں انگریزی کا ان کا خط بھی نہایت پختہ اور جامع ہے جو انگریزی میں ان کے لکھتے رہنے کا ایک مظہر بھی ہے۔

ان تصانیف سے قطع نظر مولانا مودودی نے دکن کی تاریخ پر مستقل کتابوں کی تصنیف کے علاوہ کم از کم ایک مقالہ ایک اہم تاریخی ماخذ: ''فتوحاتِ آصفی'' مصنفہ: ابوالفیض معنی دہلوی کے مطالعے وتعارف پر بھی لکھا ہے جو غیر معروف اور غیر مدون ہے۔یہ حیدرآباد دکن سے نکلنے والے اخبار ''روزنامہ صبح دکن'' کے ''سالگرہ نمبر''، ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء میں صفحات: ۳۸۔۴۲ پر شائع ہوا تھا۔اس اخبار کے مدیر مولوی احمد عارف ان کے قریبی دوست تھے جن کے اشتراک سے انھوں نے اپنی کتاب ''تاریخِ دکن'' لکھ کر شائع کروائی تھی۔اپنی اس مذکورہ تصنیف کے لیے مولانا مودودی نے تاریخی اور مستند معلومات کے حصول کے لیے معاصر اور تازہ ہر طرح کے مآخذ اپنے پیشِ نظر رکھے تھے۔دکن کی اپنی تاریخ نویسی کا کام انھوں نے، اپنے مذکورہ منصوبے کے ذیل میں، قیامِ مملکتِ آصفیہ (۱۷۲۴ء) کے بعد دارالحکومت دہلی پر نادرشاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) تک ایک لحاظ سے مکمل کرلیا تھا۔اس کے بعد وہ اس کام کو بوجوہ آگے نہ بڑھا سکے لیکن اپنے منصوبے کے تحت مآخذ اور معلومات جمع کرتے رہے۔اس ضمن میں ان کی تصنیف ''دکن کی سیاسی تاریخ'' کے مآخذ کی فہرستوں اور کتابیات میں، جو ہر باب کے اختتام پر شامل ہے، دیکھا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے احاطہ کردہ دور سے متعلق قریب قریب سارے ہی اہم اور بنیادی مآخذ تک رسائی حاصل کرلی تھی۔وہ اپنے مصادر میں ''فتوحاتِ آصفی'' اور ''مآثرِ نظامی''، مصنفہ: لالہ منسارام کو زیادہ اہم اور قابلِ اعتماد سمجھتے تھے (۲۰)۔یہ دونوں مؤرخین باہم ہم عصر تھے اور نظام الملک آصف جاہ اول کے بھی معاصر تھے۔ان کی مذکورہ تصانیف نظام الملک ہی کے حالات وعہد کا احاطہ کرتی ہیں (۲۱)۔یہ دونوں فارسی میں ہیں اور تاحال غیر مطبوعہ ہیں۔ان دونوں میں فرق صرف اسلوب کا تھا کہ ''فتوحاتِ آصفی'' منظوم ہے جب کہ ''مآثر نظامی'' نثر میں ہے۔

''فتوحاتِ آصفی' کی طرح ممکن ہے مولانا مودودی نے ''مآثر نظامی'' کو بھی اپنے خصوصی مطالعے یا مقالے کا موضوع بنایا ہو لیکن ''فتوحاتِ آصفی'' پر ان کا مقالہ دستیاب ہے۔اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک تو مولانا مودودی کا دکن کی تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع اور پختہ تھا اور دوسرے انھوں نے ''فتوحاتِ آصفی'' کو اپنی تصنیف ''دکن کی سیاسی تاریخ'' کے لیے ایک اہم اور بنیادی ماخذ سمجھ کر اس کا مطالعہ بالاستعیاب کرنا پسند کیا تھا۔چناں چہ نہ صرف انھوں نے اپنی کتاب میں اس سے ضروری استفادہ کرتے ہوئے اس سے جگہ جگہ معلومات اخذ کیں بلکہ ضرورتاً اس کے اہم اہم اقتباسات بھی درج کیے، جو متعدد مقامات پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

چوں کہ ''فتوحاتِ آصفی'' تاحال غیر مطبوعہ ہے اور عام نہیں اس لیے اس تک رسائی، اس کا حصول اور اس سے

ضروری استفادہ ایک خاص جستجو اور تلاش کا نتیجہ ہے۔اس کے قلمی نسخے بھی عام نہیں۔ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور دو نسخے مملکت کے دفتر استیفا میں محفوظ ہیں،(۲۲) جب کہ ایک نسخہ 'گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری، مدراس' میں بھی موجود ہے(۲۳)۔اس کی کمیابی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مودودی نے اس سے استفادے کے لیے یقیناً کافی تگ ودو کی ہوگی۔انھوں نے جس نسخے سے استفادہ کیا اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کہاں موجود ہے۔چوں کہ کتب خانۂ آصفیہ کا مخزونہ نسخہ آب رسیدہ اور ناقص الطرفین ہے،اس لیے شاید اس سے استفادہ نہیں کیا گیا،ممکن ہے کہ دفتر استیفا کے نسخے ان کے ملاحظے میں رہے ہوں۔

ابوالفیض معنی دہلوی کے بارے میں شمس اللہ قادری (متوفی ۱۹۵۳ء) نے تحریر کیا ہے کہ وہ مرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴ء۔۱۷۲۰ء) کا شاگرد رہا ہے۔ابتدأ میں شاہجہاں آباد کے محلہ گلاب واڑی کا رہائشی تھا۔آصف جاہی افواج کے ساتھ اورنگ آباد آیا اور نواب شاہنواز خان صمصام الدولہ (متوفی ۱۷۵۸ء) کی مصاحبت اختیار کی۔قاضی محمد صادق اختر (۱۸۰۷ء۔۱۸۵۸ء) کے ''تذکرہ آفتاب عالم تاب'' میں اس کا احوال ملتا ہے(۲۴)، جب کہ علی حسن خان (۱۸۶۶ء۔۱۹۳۶ء) کے ''تذکرہ صبح گلشن''(۲۵)؛اور مظفر حسین صبا (متوفی ۱۹۲۹ء) کے ''تذکرۂ روزِ روشن''(۲۶) میں بھی اس کا احوال موجود ہے۔

شمس اللہ قادری کے مطابق ''فتوحاتِ آصفی'' جانشینانِ اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ اور نظام الملک آصف جاہ کی مفصل سوانح حیات ہے۔اس کا آغاز اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے ہوتا ہے اور اس میں محمد شاہ (۱۷۱۹ء۔۱۷۴۸ء) کے پچیسویں سالِ جلوس (۱۷۴۴ء) تک چھے بادشاہوں اور پانچ دعویدارانِ سلطنت کا تذکرہ کیا ہے۔اس کے ساتھ تاریخ اور عہد کے لحاظ سے آصف جاہ کے حالات،مختلف صوبہ جات کی حکومت، دربارِ دہلی کی وزارت،دکن کی فتوحات وغیرہ بیان کی گئی ہیں۔ان واقعات پر کتاب کا دو تہائی حصہ مشتمل ہونے کی وجہ سے مصنف نے اس کا عنوان ''فتوحاتِ آصفی'' رکھا ہے۔۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۴ء تک کے واقعات شامل کرنے کے بعد کتاب ختم ہوگئی ہے۔اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

بنامِ شہنشاہِ ملکِ بقا　　کہ شاہنشہا نند پیشِ گدا

مصنف نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے:

ابوالفیض معنی کہ ہست از ازل　　بیک بینی و یک دلی بے بدل

کتاب کے موضوع اور اس کے عنوان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

بہ نظم آرم ازعون لطفِ خدا بہ شرطے کہ　　عمرم　　نماید وفا

زِاحوال چل سالِ ہندوستان در آوردہ　　ام از قلم در زبان

چو اکثر فتوحات این جم جناب رقم ساختہ کردم آن را کتاب
پدید از شرف در پس اختتام فتوحاتِ آصف ز حق یافت نام(۲۷)

شمس اللہ قادری کے اس تعارف کے مقابلے میں مولانا مودودی کا مقالہ، بہ اعتبارِ تقاضہ، خاصا مفصل اور تجزیاتی ہے۔اس کے آغاز اور اختتام میں مولانا مودودی نے شدید اور جائز گلہ کیا ہے کہ دکن کی تاریخ پر نہایت قیمتی اور مفید مآخذ اور مصادر کتب خانوں میں بکھرے پڑے ہیں لیکن ان سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا جاتا۔دکن کے مطالعے کو جو توجہ اور اہمیت دی جانی چاہیے تھی وہ نہیں دی جاتی اور جامعات کے نصابات میں بھی دکن کی تاریخ کے مطالعے سے افسوس ناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔

اس مقالے سے جہاں دکن کی تاریخ پر مولانا مودودی کے عبور اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے وہیں تاریخ نویسی اور خصوصاً دکن کی تاریخ نویسی کے بارے میں مولانا مودودی کے خیالات وضاحت سے سامنے آتے ہیں۔چوں کہ یہ ان کی غیر مدون اور کمیاب تحریر ہے،اس لیے استفادۂ عام کے لیے بعینہٖ ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔تمام حواشی اس عاجز مرتب نے تحریر کیے ہیں:

فتوحاتِ آصفی

آصف جاہ اوّل کی ایک منظوم سوانح عمری

از مولوی سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

تاریخ دکن کی تحقیق کے سلسلے میں مجھ کو بہت سی ایسی قلمی کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جنھیں پڑھ کر مجھے تعجب اور افسوس ہوا کہ تاریخی معلومات کے ایسے اہم ذخائر اب تک عام ناظرین کی دسترس سے باہر ہیں اور ان کو شائع کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔میرا اندازہ ہے کہ تاریخ دکن کے متعلق جتنا مواد اب تک شائع ہو چکا ہے تقریباً اتنا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ مواد غیر مطبوع پڑا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس خطۂ ملک کی تاریخ کے متعلق ناکافی مواد کی بنا پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ طرح طرح کی غلطیوں سے لبریز نظر آتا ہے۔اکثر غلط تاریخی واقعات نے رواجِ عام پا لیا ہے۔بہت سے اہم واقعات جنھوں نے تاریخ بنانے میں خاص حصہ لیا ہے،سرے سے تاریکی ہی میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے تاریخ کا علم ناقص رہ گیا ہے۔ان کے علاوہ جو واقعات روشنی میں آ بھی گئے ہیں،ان میں سے ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس کا ایک پہلو روشن ہو گیا ہے اور باقی پہلو تاریکی میں ہیں۔اس لیے اس کے متعلق جو رائیں اور نظریے قائم کر لیے گئے ہیں،وہ صحیح نہیں ہیں۔اگر صحیح و مستند ذرائع معلومات موجود نہ ہوتے تو اس ناقص علم پر قناعت کرنا ایک حد تک بجا ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذرائع کی ہرگز کمی نہیں ہے۔حیدرآباد میں کم از کم دکن کے اسلامی عہد کی تاریخ کے متعلق ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے

جس سے ہر زمانے کے حالات پر کافی روشنی پڑسکتی ہے اور اگر دکن کی دوسری قدیم بستیوں اور پرانے خاندانوں میں تلاش وجستجو کی جائے تو شاید اس ذخیرہ پر معتد بہ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا علم کے اس نقصان کی وجہ بجز اس کے اور کچھ قرار نہیں دی جاسکتی کہ اہل دکن کو اپنے ملک کی تاریخ سے صحیح دل چسپی نہیں ہے، اور یہی عدم دل چسپی اس کی ذمہ دار ہے کہ ان کی تہذیب، ان کے تمدن، ان کے علوم وفنون، ان کے نام ور اسلاف کے کارناموں اور ان کے حال کی تعمیر کرنے والے ماضی کا ایک بڑا حصہ پردۂ تاریکی اور گوشۂ گم نامی میں پڑا ہوا ہے۔

میں اس مضمون کے ذریعے سے ملک کو جن اہم تاریخی ذرائع معلومات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں نمونے کے طور پر ان میں سے ایک وہ کتاب ہے جس کا نام زینت عنوان ہے۔مغفرت مآب نواب آصف جاہ اوّل کے ہم عصر مصنفین نے ان کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے۔مگر سب سے زیادہ مفصل معلومات دو مصنفوں نے فراہم کی ہیں۔ایک منسارام صاحبِ ''ماثر نظامی''، دوسرا ابوالفیض صاحبِ ''فتوحات آصفی''۔اور بدقسمتی دیکھیے کہ ان دونوں کی کتابیں اب تک اشاعت سے محروم ہیں۔جہاں تک تاریخی اسناد واعتبار کا تعلق ہے، میرے نزدیک ابوالفیض منسارام سے بھی زیادہ لائق ترجیح ہے کیوں کہ اس نے نواب آصف جاہ کی زندگی کا وہ زمانہ بچشم خود دیکھا ہے جب منسارام شاید پیدا بھی نہ ہوا تھا اور اگر پیدا ہوا تھا تو اس وقت بچہ تھا۔عالم گیر کے بیٹوں کی خانہ جنگی سے لے کر نادرشاہ کی آمد تک کا سارا پُرآشوب زمانہ اس نے دربارِ شاہی کے قریب گزارا ہے۔متعدد لڑائیوں کے موقع پر خود موجود رہا ہے اور امرائے شاہی میں سے بہت سے اشخاص کو ذاتی حیثیت سے جانتا ہے۔فرخ سیر (۲۸) اور محمد شاہ کے درباروں کا نقشہ اس طرح کھنچتا ہے کہ زندہ تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔پہلے وہ صمصام الدولہ خانِ دوراں (۲۹) کا متوسل تھا جو فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد میں درباری سازشوں کا ایک بڑا رکن اور ہندوستان کی سیاسی شطرنج کے مہروں میں سے ایک اہم مہرہ تھا۔ہنگامۂ نادرشاہی میں جب خانِ دوراں مارا گیا تو ابوالفیض نے نواب آصف جاہ کے بڑے بیٹے، نواب غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ (۳۰) کا توسل اختیار کیا اور اس کے بعد خود آصف جاہ بہادر نے اس کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔اسی زمانے میں اس نے غالباً فیروز جنگ کے اشارے سے نواب آصف جاہ کی یہ منظوم سیرت لکھنی شروع کی اور نواب کی وفات سے دو تین سال پہلے تک واقعات کا ذکر کرکے اسے ختم کردیا، جس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید اس نے نواب سے پہلے وفات پائی۔گو کتاب میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ خود نواب آصف جاہ نے بھی اس کو ملاحظہ کیا تھا یا نہیں، لیکن یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ نواب کا ایک ملازم ایسی اہم چیز ان کے متعلق لکھ رہا ہو اور ان کو اس کی خبر نہ ہو۔لہٰذا ہم یہ رائے قائم کرسکتے ہیں کہ مصنف کو مستند اور صحیح معلومات بہم پہنچانے میں نواب آصف جاہ بہادر کی جانب سے بھی ضرور مدد ملی ہوگی اور نواب کے اہلِ خاندان، خاص ملازموں اور مدت العمر کے ساتھیوں سے بھی اس نے بہت کافی استفادہ کیا ہوگا۔

اس بیان سے مجملاً اتنا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نواب آصف جاہ کی سیرت پر جتنی معتبر کتابیں اس وقت معلوم و

معروف ہیں ان میں ''فتوحاتِ آصفی'' سب سے زیادہ ممتاز ہے۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ کتاب میں سے چند مثالیں بھی ایسی پیش کروں جن سے اس کی اہمیت پوری طرح واضح ہوجائے۔

نواب آصف جاہ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ اخیر زمانہ میں عالم گیر بادشاہ نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی ان سے بیاہ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اس واقعے کو متداول تاریخوں میں کہیں جگہ نہیں ملی۔حتیٰ کہ شاہ نواز خاں(۳۱)، خافی خاں(۳۲)اور آزاد بلگرامی(۳۳) جیسے ہم عصر مورخوں نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔منسارام نے بلاشبہ اس کا ذکر کیا ہے،مگر وہ صرف اس قدر بیان کرتا ہے کہ بادشاہ نے کسی شہزادے کے ساتھ ان کو منسوب کرنا چاہا تھا۔اس سے زیادہ سے زیادہ اگر کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ عالم گیر کی نگاہ میں چین قلیچ خاں بہادر(۳۴) کی خاندانی اور ذاتی عزت اتنی زیادہ بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ان کو شاہی خاندان سے رشتے داری کا شرف بخشنے کے لائق سمجھتا تھا۔لیکن ابوالفیض نے اس سے آگے بڑھ کر یہ تصریح کردی ہے کہ وہ لڑکی جس سے عالم گیر بادشاہ قلیچ خاں بہادر کی شادی کرنا چاہتا تھا، بادشاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش(۳۵) کی لڑکی تھی۔اس تصریح نے معاملے کی اہمیت کو کہیں سے کہیں پہنچادیا۔اب یہ معاملہ صرف چین قلیچ خاں بہادر کے خاندانی اور ذاتی وقار اور ان کے حال پر بادشاہ کی غیر معمولی عنایات ہی کی حد تک نہیں رہتا، بل کہ اس سے ایک طرف عالم گیر بادشاہ کی نہایت عمیق سیاسی بصیرت اور غایت درجہ دور اندیشی پر روشنی پڑتی ہے اور دوسری طرف معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر نواب نظام الملک آصف جاہ نے جس قدر اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت، تدبر اور فوجی وسیاسی مہارت کے جوہر دکھائے وہ سب عالم گیر نے اسی زمانے میں محسوس کر لیے تھے، جب کہ وہ محض چین قلیچ خاں اور ایک نوخیز امیرزادے تھے اور یہی جوہر دیکھ کر وہ ان سے ایک ایسا کام لینا چاہتا تھا جو اگر پورا ہوجاتا تو شاید آج ہندوستان کی تاریخ ایک دوسرے ڈھنگ پر لکھی گئی ہوتی۔جن لوگوں نے تاریخ ہند کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ عالم گیر کے بیٹوں میں کام بخش سب سے زیادہ کمزور تھا۔امراء کی کوئی طاقت ور جماعت اس کی حامی نہ تھی، بل کہ اسد خاں وزیر اعظم(۳۶) اور ذوالفقار خاں میر بخشی(۳۷) کھلم کھلا اس کے مخالف تھے۔اس بناء پر عالم گیر کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی تو کام بخش اپنے دونوں بھائیوں میں سے کسی کی ایک ٹکر بھی نہ سہار سکے گا۔اسی خطرے کی پیش بندی کے لیے اس نے یہ تدبیر سوچی تھی کہ کام بخش کی بیٹی سے قلیچ خاں بہادر کی شادی کردی جائے۔کیوں کہ اس طرح کام بخش کو نہ صرف ایک طاقت ور مددگار مل جاتا جو اپنی بیدار مغزی، سیاست دانی اور سپہ سالاری کی قابلیتوں سے مخالفین کی ساری قوتوں اور تدبیروں کا توڑ کرسکتا تھا، بل کہ اس کے ساتھ ہی امرائے تورانی کی زبردست جماعت بھی کام بخش کی حامی ہوجاتی، جس میں بڑے بڑے فوجی لیڈر اور سیاسی مدبر موجود تھے اور جس کی رہنمائی اور سرداری میں کوئی شخص قلیچ خاں بہادر کے والد نواب فیروز جنگ بہادر(۳۸) کا شریک وسہیم نہ تھا۔لیکن جب چین قلیچ خاں بہادر کو یہ پیغام دیا گیا تو کامل ایک پہر تک انھوں نے اس کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور آخر ترک ادب کا عذر کرکے نسبت قبول کرنے سے انکار

کر دیا۔اس سے نواب آصف جاہ کی انتہائی دور اندیشی اور غایت درجہ بالغ نظری ظاہر ہوتی ہے۔شہنشاہ عالم گیر کی پوتی سے منسوب ہونا اتنا بڑا اعزاز تھا کہ اس وقت کے بڑے بڑے امراء اس کی تمنا بھی نہ کر سکتے تھے۔ یہ اعزاز اپنے ساتھ جاہ ومنصب اور مال ودولت کی جو فراوانیاں لاتا اس کا لالچ ایسا بڑا لالچ تھا جو بڑے سے بڑے عاقل وفرزانہ شخص کو بھی اپنے دام میں پھانس لیتا۔لیکن نواب آصف جاہ نے کام بخش کی سیرت، اس کے مخالفوں کی قوت اور واقعات کی آئندہ رفتار کا اندازہ کر کے یہ سمجھ لیا کہ اپنی قسمت کو کام بخش کے (ساتھ) وابستہ ہونا (کرنا) اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے۔اس لیے انھوں نے اس لالچ کو عقل پر غالب نہ آنے دیا اور اس زبردست اعزاز کو رد کر دیا جو بے مانگے انھیں مل رہا تھا۔غور کرو کہ اس واقعہ کا صرف ایک ذرا سا پہلو نمایاں ہو جانے سے کس قدر اہم تاریخی حقائق روشنی میں آ گئے۔

شاہ عالم بہادر شاہ(۳۹) کے مقابلے میں شہزادۂ اعظم (۴۰) کی ناکامی کے اسباب بیان کرتے ہوئے مصنف نے دو اہم باتوں کی تصریح کی ہے۔ایک یہ کہ وہ اعلانیہ شیعیت کی طرف مائل تھا۔جس سے سنی امراء اور ارکانِ سلطنت اس کے مخالف ہو گئے تھے، دوسرے یہ کہ اپنے غرور وتکبر سے اس نے ہر خورد وکلاں کو بیزار کر دیا تھا۔اسی وجوہ سے نواب آصف جاہ کے والد غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ نے تورانی امراء کو، جو زیادہ تر دکن کی فوج میں شریک تھے، اعظم سے الگ ہو جانے کا مشورہ دیا اور اس مشورے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعظم کی جنگی قوت کا ایک بازو شل ہو گیا۔

فرخ سیر کے آخری زمانے میں جب بادشاہ گر سیدوں کا فتنہ زیادہ بڑھا اور نواب نظام الملک مشورے کے لیے مراد آباد سے دہلی طلب کیے گئے تو انھوں نے بادشاہ سے صاف طور پر کہہ دیا کہ آپ سید عبداللہ خاں(۴۱) کو معزول کر کے مجھے وزیر اعظم بنائیں اور چالیس لاکھ روپے فوج کے مصارف کے لیے عطا کیجیے، اس کے بعد میں ان دونوں بھائیوں سے نمٹ لوں گا۔لیکن فرخ سیر نے اسے قبول نہ کیا اور تھوڑی مدت نہ گزری تھی کہ سیدوں نے اسے معزول اور قتل کر دیا۔اس کے بعد بادشاہ گری کا سلسلہ شروع ہوا یہاں تک کہ محمد شاہ تخت پر بٹھایا گیا اور اس کی حیثیت بھی سیدوں کے ہاتھ میں ایک قیدی کی سی رہی۔اس موقعے پر تمام ہندوستان کے امراء میں کوئی بھی اتنی جرات نہ رکھتا تھا کہ دونوں سیدوں کے مقابلے میں سر اٹھاتا۔ اس امرِ خطیر کا بیڑا اگر کسی نے اٹھایا تو وہ تنہا نواب نظام الملک تھے۔انھوں نے تیموری خاندان کو کامل تباہی سے بچانے کے لیے مالوہ میں دونوں سیدوں کے خلاف علم جنگ بلند کر دیا، اور ملک کی رائے عامہ کو اپنی موافقت میں برانگیختہ کرنے کے لیے مالوہ سے لے کر دکن تک تمام مسجدوں میں احکام جاری کروائے کہ جمعے کے دن خطبے میں علی الاعلان یہ کہا جائے:

محمد شہ بندی دین پناہ
کہ در قید چوں در خسوف است ماہ
ضرور است بر جملۂ مومناں
کہ بخشند او را رہائی ازاں

ان واقعات کو ابوالفیض نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے بہت سی اہم جزئیات پر روشنی پڑتی ہے۔

مالوہ اور گجرات پر مرہٹوں کے تسلط کے اسباب اس نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں اور اس سلسلے میں خود اپنے آقا صمصام الدولہ خان دوراں کی غلطیوں پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ صاف لکھتا ہے کہ مالوہ اور گجرات میں مغل حکومت کا خاتمہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ جے سنگھ (۴۲) اور ابھے سنگھ راٹھور (۴۳) جیسے لوگ ان صوبوں کے حاکم مقرر کیے گئے اور یہ دونوں صمصام الدولہ کے خاص آدمی تھے اور اس کے مشورے سے مقرر کیے گئے تھے۔ جے سنگھ کے متعلق وہ لکھتا ہے:

زوقتے کہ اسلام در ہند راست
چنیں راجۂ بدسیر برنخاست
بود ہمتش روز و شب بہرایں
کہ در ہند نامے نماند ز دیں
چواں میر دریا دل باصفا الف ے
با و داد اُجین وہم آگرا
ہماں کافر از غیرت کافری
چودید از شہنشاہ بے جوہری
طلب کرد کفار را از دکن
کہ کردند ایں را مگر بیخ کن
غنیم لعین را ز راہ و داد
در اقلیم ہندوستان راہ داد

اسی طرح ابھے سنگھ صوبے دار گجرات کے متعلق لکھتا ہے:

چناں ظلم و بے داد را کرد سر
کہ نشیند کس زاں ستم بیش تر
شد آں شہر اسلام از کافراں
بصد ظلم و بیداد ویراں چناں
کہ ناید بشرح و بیاں از قلم
کنم گر ہمہ آں را رقم

ازیں ظلم مظلومہا بے شمار
روانہ بدہلی شدند اشکبار
بپاس دل راجہ لیک آں فغاں
نہ شہ گوش کردد نہ میر جہاں ب؎
فتاد آخر آں صوبۂ بس عظیم
زحکم الٰہی بدستِ غنیم

مرہٹوں کی شورش جب حد سے بڑھ گئی تو محمد شاہ نے نواب آصف جاہ کو دکن سے دہلی طلب کیا۔نواب دہلی اس وقت پہنچے جب ایران افغانستان میں نادر شاہ غلزئیوں کے خلاف برسر پیکار تھا۔اس کا سفیر دہلی آیا ہوا تھا اور اپنے بادشاہ کے پیغام کا جواب مانگتے مانگتے تھک گیا تھا اور مغل افغانستان کا گورنر بار بار لکھ رہا تھا کہ کابل اور ہندوستان کی سرحد غیر محفوظ ہے۔ابوالفیض کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعے پر نواب آصف جاہ نے اس خطرے کو اچھی طرح سے محسوس کر لیا تھا جو شمال مغرب کی طرف سے رونما ہو رہا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ دکنی خطرے سے ایرانی خطرہ زیادہ خوف ناک ہے۔اس لیے انھوں نے محمد شاہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ:

مدار از غنیم شقاوت اساس ج؎
بدل وہمے از ترس وہم و ہراس
ولیکن مباش اے شہ نام ور
چنیں غافل از نادر کینہ ور
کہ دارد بقندہار آں شاہ جنگ
نمود است بر غلزیاں کار تنگ
شنیدم من از مردم معتبر
کہ اوراست ایں سور و سودا بسر
کہ آید بہ تسخیر ہند از شتاب
پے جنگ دور از طریق صواب
ضروراست بر شاہ والا گہر
کہ گردد بکابل زمین راہ بر
برآید ز دہلی باعزاز و شان

شود سوے لاہور در دم رواں
مرخص نماید مرا پیش تر
کہ تا سرحد خود روم بے خطر
نشینم بغزنی زالطاف شاہ
شوم بہرآں کینہ خوسد راہ

لیکن یہ سن کر محمد شاہ نے ایک قہقہہ لگا یا اور کہا کہ بھلا افغانستان اور سرحد ہند کے تنگ دروں اور جنگ آزما پٹھان قبیلوں کی گرفت سے بچ کر نادرشاہ ہندوستان تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اس طرف سے تم بالکل بے فکر رہو اور اپنی ساری توجہ مرہٹوں کے مقابلے میں صرف کردو۔ آخر کار نظام الملک مالوہ کی طرف چلے گئے اور اس وقت واپس ہوئے جب محمد شاہ کی امیدوں کے خلاف افغانستان اور سرحد کے تنگ دروں اور جنگ آزما پٹھان قبائل دونوں نادرشاہ کے لیے ہندوستان کا راستہ کھول چکے تھے۔ ہنگامۂ نادرشاہی کے واقعات ابوالفیض نے بڑی تفصیل اور واقفیت کے ساتھ لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ:

نہ افسانہ است آنکہ بشنید ام
کہ ایں حشر آفات خود دیدہ ام

نادرشاہ کے مقابلے میں ابتدا میں کوئی جنگی کارروائی اس لیے نہیں کی جاسکی کہ نواب آصف جاہ، صمصام الدولہ اور اعتماد الدولہ (۴۴)، یہ مغل فوج کے تین بڑے سردار تھے اور ان میں سے کوئی کسی کے ماتحت کام نہیں کرسکتا تھا۔ آخر جب نادرشاہ لاہور پر قابض ہوگیا تھا تو بادشاہ گھبرا کر خود پانی پت پہنچا اور یہاں امراء کی کونسل نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ اس وقت بادشاہی فوجوں کا ایک لیڈر ہونا چاہیے اور وہ نواب آصف جاہ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ نواب آصف جاہ نے اس کے جواب میں صاف طور پر بادشاہ سے عرض کیا:

بوقتے کہ بودہ است تدبیر کار
پذیر انشد عرض ایں جاں نثار
گراں وقت تدبیر رفتے بکار
نہ قندھار ایں نہ کردے گذار
بمیدان غزنی بآں شہر یار
ز اقبال شہ کردمے کارزار
ولیکن باقبال شاہ جہاں
ز تدبیر در جنگ کوشم بجاں

بشرطیکہ یاراں جو اہل شباب
نسازند جنگ اشتبائی خراب

لیکن تہور پیشہ اور شتاب کار لوگوں نے نواب آصف جاہ کی آخری تدبیروں پر بھی پانی پھیر دیا۔ برہان الملک سعادت خاں صوبہ دار اودھ نے نواب کی رائے کے خلاف نادرشاہ سے جنگ چھیڑ دی اور صمصام الدولہ خاں دوراں بھی اس لڑائی میں شریک ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے شکست فاش کھائی اور مغل فوج کی کمزوری کا راز جو تھوڑا بہت چھپا ہوا تھا، وہ بھی فاش ہوگیا۔

مغل فوج کی اخلاقی حالت اس وقت اس قدر خراب ہو رہی تھی کہ سلطنت ہند کا میر بخشی صمصام الدولہ خان دوراں جب نادرشاہ سے شکست کھا کر زخموں سے چور اپنے لشکر میں واپس آیا تو اس کے پہنچنے سے پہلے خود اس کی فوج اس کے خیمے اور خرودگاہ کو لوٹ چکی تھی اور اس کے لیے سر چھپانے کو ایک راوٹی تک باقی نہ بچی تھی۔ ابوالفیض لکھتا ہے کہ اس دن کی صبح کو صمصام الدولہ کے خیموں اور سراپردوں کا سلسلہ ایک میل تک پھیلا ہوا تھا اور شام کو یہ کیفیت تھی کہ کہیں صمصام الدولہ کی فرودگاہ کا نام ونشان تک باقی نہ تھا۔ اس کے ملازموں کو ایک ڈیرا مستعار لینا پڑا تا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری چند ساعتیں اس میں گزار سکے۔

اس کے بعد نواب نظام الملک آصف جاہ نے نادرشاہ سے صلح کی گفت وشنید کی جس میں برہان الملک سعادت خاں (۴۵) کی غداری رخنہ انداز ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ نادرشاہ، محمد شاہ کو معززقیدی کی حیثیت سے ساتھ لے کر دہلی پہنچا۔ دہلی میں نادرشاہ کے قتل عام کا واقعہ نہایت مشہور ہے۔ مگر اس کے اسباب کی تفصیل ذرا ابوالفیض کی زبان سے بھی سنیے، وہ لکھتا ہے کہ نادرشاہ کے سپاہی ہر طرف شہر میں پھیل گئے تھے۔ سڑکوں اور گلی کوچوں میں خوف کے مارے لوگوں کا چلنا مشکل تھا۔ دکانداروں کا مال، راہ چلتوں کی جان، شرفا کی آبرو غرض کوئی چیز ان کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ حد یہ کہ گھروں میں بھی بے تکلف گھس جاتے تھے، ان کی ان حرکات سے سارے شہر میں شور مچ گیا۔ سربلند خاں مبارز الملک نے نادرشاہ سے اس کی شکایت کی تو اس نے حکم دیا کہ ہر گزرگاہ پر ایک نقیچی مقرر کر دیا جائے اور وہ ہماری فوج کو ان حرکات سے روکے۔ مگر ابھی یہ انتظام مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ سرشام یہ خبر اڑ گئی کہ محمد شاہ نے نادرشاہ کو قتل کرا دیا۔ یہ خبر سنتے ہی شہر کے عوام ایرانی فوج پر پل پڑے اور رات بھر ان کو قتل کرتے رہے۔ ایرانیوں نے رات ہی کو نادرشاہ سے اس کی شکایت کی مگر اس نے کہا:

کہ ہندی ندارند یارای آں بہ کردم بامغل ہنر منداز تواں
ولیکن شما بہر غارت گری بہ خود بستہ ازمکر ایں زرگری

مگر صبح اٹھ کر اس کی تحقیق ہوگئی تو نادرشاہ خود نکل کر آیا اور اس نے وہ ہولناک قتل عام کیا جس نے چند گھنٹوں کے اندر دہلی کو تباہ کر دیا۔ نواب فیروز جنگ نے جب دیکھا کہ اب دہلی مٹی جاتی ہے تو انھوں نے نواب آصف جاہ سے عرض کیا کہ

اس وقت آپ ہی سفارش کریں گے تو اہل شہر کی جان بخشی ہو سکے گی۔ چناں چہ وہ نادر شاہ کے پاس گئے اور جیسا کہ مشہور ہے، انھی کی سفارش سے قتل عام موقوف ہوا۔

دلّی کو لوٹ کر جب نادر شاہ ہندوستان سے واپس جانے لگا تو اس نے ایک دربار میں محمد شاہ کو ہندوستان کا تاج فرماں روائی واپس کیا اور اس موقع پر اس کو چند نصیحتیں کیں۔ ابوالفیض نے ان نصیحتوں کو اس طرح بیان کیا ہے:

شد از غفلت بادشاہ جہاں
خراب ایں چنیں ملک ہندوستاں
زبس میدہی از دلاں را سبق
نماندہ امت در ملک نظم و نسق
کنوں ہم نرفتہ است اے شہریار
شوی گرازین بے خودی ہوشیار
اگر خواہی از خود بدلہا ہراس
دگر قدر شیراز سگ شناس
بمرد جہاں دیدہ بخش اختیار
کہ کارت زرایں شود استوار
مدہ بخود خیرد او باش را
دگر شارب خمر و عیاش را
بود بے سخن آصف خیر خواہ
زروی حقیقت اتالیق شاہ
بناید کہ بے زای ایں نامدار
کنی در رہ سلطنت ہیچ کار

لیکن محمد شاہ پر ان نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور زبانی نصیحتوں کا اس شخص پر کیا اثر ہوتا جس نے اپنی بدعملی کے نہایت تلخ نتائج بھگتنے کے بعد بھی سبق حاصل نہ کیا۔ نادر شاہ کے جانے کے بعد نظام الملک نے بادشاہ کے سامنے افواج کی تنظیم جدید اور مال گزاری کی اصلاح کے متعلق ایک اسکیم پیش کی اور اسے مشورہ دیا کہ ان حالات کو مکمل کر کے اطراف ونواح کے سرکش لوگوں کی تادیب کے لیے آپ خود نکلیے اور میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ مگر محمد شاہ نے ان باتوں میں سے ایک پر بھی عمل نہ کیا اور پھر اسی قسم کے نالائق اور کینہ خصلت لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا جن کی صحبت اس سے پہلے اس کو تباہ کر چکی تھی۔

ان لوگوں کی سیرتوں پر ابوالفیض اس طرح تنقید کرتا ہے:

سر افروز کرد از امارت بدم
ہماں میر خاں را کہ بودہ علم
در آفاق از اُنبہ چوں آفتاب
اگر خاں اسحاق راہ حساب
محالات و جاگیر ہائے زیاد
باسحاق و ہم میر خاں جملہ داد
اگر کرد اسحاق خاں را نیاز
زدیوانی خالصہ سرفراز
گر میر خاں رانمود از کرم
سپہدار سرکار بخشی سوم
ازاں ربخت آب رخ بادشاہ
کہ شد چیز در ہند امیر سپاہ
بر افتاد یک بارگی برملا
زہندوستان رسم شرم و حیا
گرفت آں امیر از فریق سپاہ
عیار جواں مردی از قدر باہ
زاد باش و از بانکہ و لوطیاں
کہ بودند در جملہ ہندوستاں
طلب کرد دنیود از بہر کار
زمنصب سرفراز در روزگار
چو آید بدرگاہ شاہ آں امیر
شود آ نقد شاہ عشرت پذیر
کہ از ملک پروان نماندہ گر
شود ازمے صحبتش بے خبر

محمد شاہ کی یہ روش دیکھ کر آصف جاہ اصلاح سے مایوس ہو گئے اور انھوں نے اعتماد الدولہ میر قمر الدین خاں سے کہا کہ جہاں میر خان جیسوں کو یہ اقتدار حاصل ہو ایسی جگہ وزارت کرنا تمھارے لیے موجب عار ہے۔تم میرے ساتھ دکن چلو۔ چناں چہ دونوں امیر دہلی سے روانہ ہو گئے لیکن بادشاہ نے دست خاص سے ان کو شقہ لکھا کہ تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔جس طرح تم رائے دو گے میں اسی طرح عمل کروں گا اور تمھیں اپنا وکیل مطلق بنادوں گا۔مجبوراً آصف جاہ پھر دہلی واپس ہوئے۔ بادشاہ نے ان کو خوش کرنے کے لیے میر خاں کو الہٰ آباد کے صوبہ پر بھیج دیا اور آصف جاہ نے اس کا دل بہلانے کے لیے اسد یار خاں (۴۶) نامی ایک ایسا شخص دیا جو علوم وفنون میں بے نظیر تھا۔وہ نہایت خوش کلام اور دلچسپ شخص تھا،لیکن جہاں تک انتظام مملکت کا تعلق تھا،آصف جاہ کے مشوروں کے مطابق کوئی عمل نہ کیا گیا۔بل کہ بادشاہ نے نواب آصف جاہ اور اعتماد الدولہ کے درمیان نفاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔اسی زمانے میں علی ویردی خاں (۴۷) نے بنگال میں شورش برپا کی اور شجاع الدولہ (۴۸) کے خاندان کو بے دخل کر کے تمام بنگال، بہار، اڑیسہ پر قبضہ کرلیا۔نواب آصف جاہ نے محمد شاہ سے کہا کہ اس حرکت سے چشم پوشی ہرگز نہ کرنی چاہیے۔اس طرح دوسرے لوگوں کو بھی بغاوت کی جرأت ہوگی اور تمام صوبے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔مگر بادشاہ نے ان کی رائے کے خلاف علی ویردی خاں کو مہابت جنگ کا خطاب،خلعت اور صوبہ داری کا پروانہ بھیج دیا۔بادشاہ کی یہ ناعاقبت اندیشی دیکھ کر نواب آصف جاہ حیران رہ گئے اور انھوں نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ اب دلّی میں ہرگز نہ رہیں گے۔اسی زمانے میں دکن سے خبر آ پہنچی کہ ناصر جنگ (۴۹) نے دکن میں نہایت نامناسب رویہ اختیار کر رکھا ہے۔بے حساب جاگیریں،خلعت،گھوڑے، ہاتھی اور زر وجواہر لٹائے جا رہے ہیں۔نوجوان امیر زادے کو چالاک مصاحبوں نے گھر لیا ہے اور اس کی لکھلٹ سخاوت سے فائدہ اٹھا کر ریاست کو تباہ کیے ڈالتے ہیں۔یہ حالات سن کر نواب نے دکن کی جانب رخصت حاصل کی اور پھر ہمیشہ کے لیے دلّی کو خیر باد کہا۔

اس کے بعد مصنف نے ناصر جنگ کی بغاوت،باپ بیٹوں کی لڑائی اور باپ کی فتح کے حالات لکھے ہیں اور پھر نواب انور الدین خاں (۵۰) کی صوبہ داری حیدرآباد و کرناٹک کا تھوڑا سا حال لکھ کر کتاب کو ختم کر دیا ہے۔

اس مختصر بیان سے ناظرین نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ یہ کتاب نواب آصف جاہ کی سیرت اور ان کے عہد کے سیاسی اور اجتماعی حالات کے متعلق ہمارے علم میں کتنا مفید اضافہ کرسکتی ہے۔تاریخ دکن کے ان کثیر ذرائع معلومات میں سے یہ صرف ایک کتاب کا حال ہے، جو محض ہماری غفلت کے باعث عام طالبان علم کی دست رس سے دور،مختلف گوشوں میں پوشیدہ ہیں۔اگر تلاش وتحقیق کے ساتھ فہرست بنائی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ حیدرآباد کے عام اور خاص کتاب خانوں میں صرف آصف جاہی عہد کی تاریخ کے متعلق ایسی اہم کتابیں بیس پچیس سے کم نہ نکلیں گی،جن کی اشاعت ازبس ضروری ہے۔گلبرگہ، بیدر، اورایلچپور، برہان پور، اورنگ آباد، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، کرنول، سادانور، کڑپہ، آرکاٹ اور میسور کی مستند قلمی تاریخوں کو ملا کر یہ تعداد شاید پچاس سے متجاوز ہوجائے۔ان بیش بہا جواہر کو دیکھ کر یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش

ہندوستان میں بھی یورپ کی طرح ایسے علمی ادارے قائم ہوتے جنھیں قوم کی فیاضی روپے سے بے نیاز کر دیتی اور وہ اس قسم کی کتابوں کو نئے طرز سے مرتب و مہذب کر کے مفید فہرستوں اور انڈکسوں کے ساتھ شائع کرتے ،لیکن ایک ایسے ملک میں اس قسم کی تمنا کرنا حماقت سے کم نہیں ہے جہاں غیر ملکوں کی ہر چیز عزیز اور اپنے ملک کی ہر شے حقیر و ناچیز ہے۔روم و یونان، عراق و ایران اور فرانس و انگلستان کی تاریخ سے تو اعتناء کا یہ عالم ہے کہ ہماری یونیورسٹی کا سارا نصاب نامہ اس سے بھرا پڑا ہے اور ہندوستان کی تاریخ سے یہ بے اعتنائی ہے کہ اس کی تاریخ کو اس نصاب نامے میں بہت تھوڑی جگہ ملی ہے اور اس تھوڑی جگہ کا بھی بیشتر حصہ ان کتابوں نے لے لیا ہے جن میں ہم اپنے آپ کو غیروں کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔تاہم ہندوستان کی مجموعی تاریخ پر کچھ نہ کچھ پڑھایا تو جاتا ہے۔دکن جو خود اپنا گھر ہے اور جس کی تاریخ کا علم اگر فی الواقع تاریخ کا علم ضروری ہے تو۔۔۔۔اس ملک کے ہر بچے کو حاصل ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے، اس تھوڑے سے شرف سے بھی محروم رہا۔ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم تک پورے نصابِ درس پر ایک نظر ڈالی جائے۔آپ دیکھیں گے کہ صرف ثانوی تعلیم میں ملک کے بچوں کو دکن کی تاریخ سے مجملاً روشناس کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد دکن کی تاریخ ہندوستان کی عام تاریخ کا ایک ضمیمہ بن کر رہ جاتی ہے جس کو پڑھ کر اس خطۂ ملک کے ایک فارغ التحصیل گریجویٹ کو اپنے ورنگل، گولکنڈہ، گلبرگہ، بیدر، دولت آباد، بیجاپور اور بیجانگر کے متعلق اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جتنی وہ اجین، اجمیر، دہلی، قنوج اور پٹنہ کے متعلق رکھتا ہے۔اور اس ذخیرۂ علم کا موازنہ اس واقفیت سے کیا جائے جو اسے یونان، روم، فرانس اور انگلستان کے متعلق حاصل ہے تو شاید یہ اس کے مقابلے میں بالکل ہی حقیر پایا جائے۔پھر اگر ایسی تعلیمی فضاء میں نشوونما پانے کے بعد وہ اپنے ملک کی زینت، اپنے وطن کے علوم وفنون، اپنی قوم کے عالی قدر فرماں رواؤں، سپہ سالاروں اور مدبروں اور اپنی ملّت کے مایہ ناز علماء، شعراء، ادباء اور ماہرینِ فنون سے ناآشنا اور ان کی حقیقی عظمت وشان سے بے خبر رہیں اور ان کو ناقابلِ اعتناء سمجھ کر تمام تر دوسرے ملکوں کی تہذیب وتمدن کو خراج تحسین ادا کرنے اور غیر قوموں کے نام ور ابطال کی ثناء ووصف کے ترانے گانے میں مشغول رہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

الف ۔صمصام الدولہ خاں دوراں مراد ہے (مودودی)۔ ب ۔یہی صمصام الدولہ مراد ہے (مودودی)۔ ج ۔مرہٹے مراد ہیں (مودودی)

مراجع وحواشی

(۱) اختر، سفیر "ادب اور ادیب، سید مودودی کی نظر میں" ص ۱۰، واہ کینٹ: دارالمعارف، (۱۹۹۸)

(۲) ان ابتدائی تحریروں کی طباعتی تفصیلات کے لیے، ایضاً، ص ۱۱، اور "سید مودودی اور ماہنامہ معارف"، ص ۷۹، واہ کینٹ: دارالمعارف، (۱۹۹۹)

(۳) ان وابستگیوں کا ذکر، ضروری تفصیلات کے ساتھ سید مودودی کی 'خودنوشت میں موجود ہے، مشمولہ: سفیر اختر، "ادب اور ادیب، سید مودودی کی نظر میں"، ص ۱۹۔۴۴، خصوصاً ص ۲۶۔۲۸؛ ایضاً، "سید مودودی اور ماہنامہ معارف"، ص ۹۱۔۹۳

(۴) ایضاً،ص ۲۸ و نیز محمد رفیع الدین فاروقی، "مولانا مودودی اور حیدرآباد دکن"، مشمولہ: "تذکرہ سید مودودی"، جلد ۳،ص ۳۱۵، مرتبہ جمیل احمد رانا، سلیم منصور خالد، لاہور: ادارۂ معارف اسلامی، (۱۹۹۸ء)

(۵) اسی ضمن میں مصطفی اکامل پاشا کی کتاب ''مسئلہ شرقیہ'' کا اردو ترجمہ بھی شمار کیا جاسکتا ہے جو اگرچہ نیاز فتحپوری کے نام سے 'صوفی پرنٹنگ پریس، منڈی بہاالدین سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا اور اس پر نیاز صاحب کے سہو کی وجہ سے مصنف کا نام 'مصطفیٰ کمال پاشا' چھپ گیا۔ اس بارے میں تفصیلات کے لیے: سفیر اختر، ''سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کا سرمایہ قلم، بھولی بسری تحریروں کی روشنی میں''، ۲۰۰۴ء، دارالمعارف، واہ کینٹ، ص ۱۴، ۲۷۔۲۸

(۶) ان مضامین کی اشاعتی تفصیلات کے لیے: سفیر اختر، ایضاً،ص ۱۰۔۱۱

(۷) سید مودودی، "خودنوشت"، مشمولہ محولہ بالا،ص ۲۰

(۸) شائع کردہ: کتب خانۂ رحیمیہ، دہلی، ۱۹۲۸ء۔ یہ تصنیف بعد میں ۱۹۴۱ء میں عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد نے دوبارہ شائع کی۔ اس کی دوسری اشاعت میں کچھ ترامیم بھی شامل کی گئی تھیں، جیسے ''معاہدۂ برار'' کا متن اضافہ کیا گیا۔ سفیر اختر صاحب نے حیدرآباد ہی سے ایک تیسری اشاعت کا امکان ظاہر کیا ہے اور اس کی تائید میں نواب بہادر یار جنگ کے خط کی ایک عبارت نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سید مودودی کو اس کتاب کی تیسری اشاعت کا اعزاز یہ روانہ کرنے والے ہیں'۔ خط کی عبارت یہ ہے: ''تیسرے ایڈیشن کا (معاوضہ) انشااللہ ماہ جون کے ختم تک حاضر خدمت کروں گا''، نواب بہادر یار جنگ، ''مکاتیب بہادر یار جنگ''، مرتبہ صمدانی نقوی، بہادر یار جنگ اکادمی، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۷ و نیز ''سید مودودی اور ماہنامہ معارف''، ص ۹۳۔۹۴؛ لیکن خط کی اس عبارت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تیسری اشاعت واقع ہو چکی ہو۔ اس کا منصوبہ پیش نظر ہو سکتا ہے اور یہاں اعزاز یہ پیشگی دیے جانے کا ذکر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی مزید ایک اشاعت (سوم) کا اہتمام ہفت روزہ ''آئین''، لاہور نے ۲۵۔جون ۱۹۸۷ء میں اپنی خصوصی اشاعت کے طور پر کیا۔ اس کی اشاعت اول 'کتب خانہ انجمن ترقی اردو'، کراچی میں موجود ہے۔ مملکت حیدرآباد اور حکومت برطانیہ کے تعلقات کے موضوع پر ایک حیدرآبادی مصنف سید بادشاہ حسین حیدرآبادی نے بھی ۱۹۳۸ء میں اسی عنوان کے تحت اخبار ''رہبر دکن'' کے ''جشن سیمیں نمبر'' بابت ۱۳۵۵ھ میں ایک تفصیلی مضمون شائع کیا تھا۔ ص ۳۱۔۳۳

(۹) ''دولتِ آصفیہ اور حکومتِ برطانیہ''، اشاعتِ اول،ص ۱ (۱۰) ایضاً،ص ۱

(۱۱) محمد رفیع الدین فاروقی، تصنیفِ مذکور میں ان مضامین کی فہرست درج ہے، جو تعداد میں ۱۲ ہیں، ص ۳۱۵

(۱۲) تفصیلات کے لیے: ایضاً،ص ۳۱۷؛ اس ضمن میں متعلقہ دستاویزات کو سید شکیل احمد ''مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، چند اسناد و مآثر دکن کی روشنی میں''، مشمولہ: یادگاری مجلہ بموقع چھٹا آل انڈیا اجتماع جماعت اسلامی ہند''، ۲۰ تا ۲۳ فروری، ۱۹۸۱ء، بمقام حیدرآباد، ص ۲۵۹۔۲۶۳ سے اخذ کر کے ''آئین'' کی محولہ بالا اشاعت میں صفحات: ۶۔۸ پر نقل کر دیا گیا ہے۔

(۱۳) مطبوعہ: دارالاشاعت سیاسیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء؛ بعد میں یہ کتاب اسلامک پبلیکیشنز، لاہور سے اگست ۱۹۶۸ء میں اور پھر جون ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ (۱۴) مطبع عہد آفریں، حیدرآباد، ۱۳۵۱ھ

(۱۵) مشمولہ: ''ادب اور ادیب، سید مودودی کی نظر میں''، ص ۱۹، ۴۳؛ یہ اطلاع خود مولانا مودودی کی تحریر ''خودنوشت''، (مشمولہ: ''ادب اور ادیب، سید مودودی کی نظر میں''، تصنیف مذکور، ص ۲۹) سے ملتی ہے، جو ان کی ۱۹۳۲ء کی تحریر ہے جب کہ اس تصنیف کا ذکر اور اشاعتی تفصیلات کسی اور جگہ دستیاب نہیں۔ یہاں تک کہ نصیرالدین ہاشمی صاحب نے ''دکن کی تاریخوں پر ایک نظر'' (مشمولہ: ''تاریخ و سیاست''، کراچی، نومبر ۱۹۵۳ء، ص ۹۸-۶۱) کے عنوان سے اپنی مُرتّبہ وضاحتی فہرست میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا، جو ان کی قریب العہد تصنیف ہے۔ اس تصنیف کے دو نسخے ''کتب خانہ انجمن ترقی اردو''، کراچی میں شمار: الف ۱۹/ ۳، ۱۰ اور ۱۱ کے تحت موجود

ہیں۔راقم نے اس تصنیف پر ایک علیحدہ تعارفی مضمون تحریر کیا ہے۔''تاریخ دکن: ایک نادر تصنیف''، مشمولہ: ''معارف مجلہ تحقیق''، جنوری۔جون، ۲۰۱۴ء، ص ۱۔۸

(۱۶) سید محمد جعفری، ''اسٹار ڈائرکٹری'' اسٹار پریس، الہ آباد، سن ندارد، ص ۴۴۴۔۴۴۵؛ ''صبح دکن'' ۱۹۲۸ء میں جاری کیا تھا، سید ممتاز مہدی، ''حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات''، قومی کونسل برائے قومی زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۴۱؛ دارالعلوم، حیدرآباد سے فارغ التحصیل تھے۔۱۹۴۸ء میں یہ اخبار بند ہوگیا، طیب انصاری، ''حیدرآباد میں اردو صحافت''۔ص ۱۶۰ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد، ۱۹۸۰ء

(۱۷) دیباچہ، ص ۲ (۱۸) ایضاً (۱۹) مرتبہ: سلیم منصور خالد، ص ۲۲۔۵۰، شائع کردہ 'ادارۂ معارف اسلامی'، لاہور، ۱۹۸۴ء،

(۲۰) مولانا مودودی ''فتوحاتِ آصفی''، مشمولہ: ''روزنامہ صبح دکن''، سالگرہ نمبر، ص ۳۸، ۱۳۵۱ھ

(۲۱) ان دونوں مؤرخین اور ان کی تصانیف پر شمس اللہ قادری نے اپنی تصنیف ''مؤرخین دکن''، میں تعارفی شذرات تحریر کیے ہیں۔''مآثرِ نظامی'' کے لیے: ص ص ۱۳۔۱۵؛ ''فتوحاتِ آصفی'' کے لیے: ص ۵۔۶

(۲۲) شمس اللہ قادری، تصنیفِ مذکور، ص ۶؛ یہ آب رسیدہ اور ناقص الطرفین ہے۔تفصیلات کے لیے: ''فہرست کتب خانہ سرکار عالی''، جلد سوم، دارالطبع سرکار سرعالی، ۱۳۵۵ھ، ص ۹۶؛ یہاں فہرست نگار نے اس کا عنوان ''تاریخ فتوحاتِ آصفی منظوم (شاہ نامۂ دکن)'' تحریر کیا ہے اور اسے سہواً میر محمد احسن المتخلص بہ ایجاد کی تصنیف قرار دیا ہے۔

(۲۳) چندر سیکھرن، ٹی، *A Catalogue of Persian and Arabic Manuscripts in the Government Oriental Manuscripts Library, Madras* مدراس، ۱۹۶۱ء، ضمیمہ، ص ۱۳؛ ان نسخوں میں اس کا عنوان الگ الگ بھی ملتا ہے، جیسے: ''تاریخ فتوحاتِ آصفی منظوم'' اور مثنوی فتوحاتِ آصفی''۔سی۔اے۔اسٹوری (C.A.Storey)، *Persian Literature, a bio-bibliographical Survey.* جلد اول، ص ۶۰۵، ۷۴۸، ۱۳۳۱

(۲۴) شمس اللہ قادری، تصنیف مذکور، ص ۶ (۲۵) مطبوعہ: مطبع شاہجہانی، ۱۲۹۵ھ، ص ۴۳۱

(۲۶) مرتبہ: محمد حسین رکن زادہ آدمیت، کتاب خانۂ رازی، تہران، ۱۳۴۳ش، ص ۷۴۸

(۲۷) شمس اللہ قادری، تصنیفِ مذکور، ص ص ۵۔۶ (۲۸) ۱۷۱۳ء۔۱۷۱۹ء (۲۹) صمصام الدولہ خان دوراں خواجہ عاصم

(۳۰) ۱۶۵۰ء۔۱۷۱۰ء (۳۱) ۱۶۹۹ء۔۱۷۵۸ء (۳۲) ۱۶۶۷ء۔۱۷۳۲ء (۳۳) ۱۷۰۴ء۔۱۷۸۶ء

(۳۴) نظام الملک آصف جاہ (۳۵) متوفی ۱۷۰۸ء (۳۶) متوفی ۱۷۱۷ء (۳۷) ۱۶۵۷ء۔۱۷۱۳ء

(۳۸) والد چین قلیچ بیگ نواب آصف جاہ (۳۹) ۱۷۰۷ء۔۱۷۱۲ء (۴۰) ۱۶۵۳ء۔۱۷۰۷ء

(۴۱) متوفی ۱۷۲۳ء (۴۲) متوفی ۱۷۴۳ء (۴۳) اجے سنگھ راٹھور

(۴۴) میر قمر الدین خان، ۱۶۷۰ء۔۱۷۴۸ء (۴۵) برہان الملک سعادت خان، ۱۷۳۹ء (۴۶) متوفی ۱۷۴۵ء

(۴۷) متوفی ۱۷۵۶ء (۴۸) ۱۷۳۱ء۔۱۷۷۵ء (۴۹) متوفی ۱۷۵۱ء (۵۰) ۱۶۴۵ء۔۱۷۴۸ء